اُردو کور کی معاون درسی کتاب

دھنک

گیارھویں جماعت کے لیے

विद्यया ऽमृतमश्नुते

एन सी ई आर टी
NCERT

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

Dhanak,
Supplementary Reader of Urdu
Core Course for Class XI

ISBN 978-93-5007-186-1

جملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جارہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کر کے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جاسکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جاسکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظرثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چپکی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصور ہوگی اور ناقابل قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
شری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلور - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکتہ - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

اشاعتی ٹیم

ہیڈ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ	:	نیرجا شکلا
چیف پروڈکشن آفیسر	:	شیو کمار
چیف ایڈیٹر	:	شویتا اُپّل
چیف بزنس منیجر	:	گوتم گانگولی
ایڈیٹر	:	پرویز شہر یار
پروڈکشن اسسٹنٹ	:	پرکاش ویر

پہلا ایڈیشن

نومبر 2011 اگہن 1933

PD 5T SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، 2011

قیمت : ₹ 65.00

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے جگدمبا آفسیٹ -374، ننگلی شنکروتی انڈسٹریل ایریا، نجف گڑھ، نئی دہلی 110043۔ میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

'قومی درسیات کا خاکہ-2005' میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکولی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر کتابی علم کی اُس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں اسکول، گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل رہے ہیں۔ نئے قومی درسیات پر مبنی نصاب اور درسی کتابوں کی تیاری اسی بنیادی مقصد پر عمل آوری کی ایک کوشش کہی جا سکتی ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امّید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی (1986) میں مذکور تعلیم کے 'طفل مرکوز نظام' کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار ان اقدامات پر ہے کہ اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کے سلسلے میں بچوں کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچّوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محلِ وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب، مجوّزہ نصابی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اُسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچّوں کو بہ حیثیت شریک کار قبول کریں اور ان سے اُسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقرّرہ معلومات کا جانکار نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے نظام الاوقات (Time-Table) اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روز مرّہ معمولات میں نرمی کی اتنی ہی اہمیت یا ضرورت ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ اور محنت کی، تا کہ تدریس کے لیے دستیاب مدّت کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جا سکے۔ تدریس اور اندازِ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعیّن ہوگا کہ یہ نصابی کتاب بچّوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ پیدا کرنے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک موثّر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اُسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچّوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجّہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے

کے لیے یہ نصابی کتاب سوچنے اور حیرتوں کو جگائے رکھنے، چھوٹے گروپوں میں بحث و مباحثہ کو فروغ دینے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکرگزار ہے۔ کونسل زبانوں کی مشاورتی کمیٹی برائے زبان کے چیئرمین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکرگزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیرمقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور و فکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

نئی دہلی
مارچ 2011

اس کتاب کے بارے میں

جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ زبان ملک کی مختلف ریاستوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت بھی اردو کی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے۔

کونسل کے ذریعے تیار کردہ 'قومی درسیات کا خاکہ-2005' کی سفارشات کے بموجب مادری زبان کی تعلیم کے واسطے پہلی جماعت سے بارھویں جماعت تک اردو میں درسی اور معاون درسی کتب، ثانوی زبان کی تعلیم کے لیے چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک اور تیسری زبان کی تعلیم کے لیے ساتویں سے دسویں جماعت تک اردو میں نئی درسی کتابیں پہلے ہی مہیا کی جاچکی ہیں۔ اب کونسل نے کوراردو درسی کتب اور معاون درسی کتب تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

'قومی درسیات کا خاکہ-2005' کے تحت پیش کی جانے والی شعری اصناف پر مشتمل یہ کتاب ''دھنک''(اردو کور کی معاون درسی کتاب) گیارھویں جماعت کے طالب علموں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس کتاب کا خاص مقصد طلبا کو زبان اور ادب سے واقف کرانا ہے تاکہ وہ مطلوبہ معیار کے مطابق صحیح اردو پڑھنا، بولنا اور لکھنا سیکھ جائیں۔ اس کتاب میں ایسے اسباق شامل ہیں جن کے مطالعے سے انسان دوستی، فرض شناسی، حب الوطنی، قومی یک جہتی اور خوش حال زندگی سے متعلق جذبات فروغ پاسکیں۔ امید ہے کہ اس سلسلے کی کتابوں کے مطالعے سے طلبا میں صحیح اردو سمجھنے، بولنے، پڑھنے، لکھنے اور خیالات کے اظہار کی خاطر خواہ صلاحیت پیدا ہو سکے گی۔

کمیٹی برائے درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمیریٹس، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمیریٹس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، پروفیسر اینڈ ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

ابن کنول، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اشفاق احمد عارفی، اردو آفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اے سی ایل (دہلی سرکار) دہلی

اقبال مسعود، سابق جوائنٹ سکریٹری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

حمید سہروردی، پروفیسر (ریٹائرڈ) گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

سلیم محی الدین، اسسٹنٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اردو، شری شواجی کالج، پربھنی

صادق، پروفیسر (ریٹائرڈ) دہلی یونیورسٹی، دہلی

صغرا مہدی، پروفیسر (ریٹائرڈ) جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صغیر افراہیم، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ضیاء الرحمٰن صدیقی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، یوٹی آر سی، سولن

محمد نفیس حسن، ٹی جی ٹی، اردو، گورنمنٹ بوائز مڈل اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی

مشتاق صدف، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی

مظفر حنفی، پروفیسر (ریٹائرڈ) کولکاتا یونیورسٹی، کولکاتا
مظہر مہدی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
منظر حسین، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی

ممبر کوآرڈی نیٹر

محمد نعمان خاں، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
دیوان حنّان خان، اسسٹنٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اظہارِ تشکر

اس کتاب کی تیاری میں ڈی ٹی پی آپریٹر ساجد خلیل فلاحی، محمد عارف رضا اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک نے دل چسپی سے حصہ لیا ہے، کونسل ان سبھی کی شکر گزار ہے۔

ترتیب

پیش لفظ	iii
اس کتاب کے بارے میں	v

غزلیات

1۔ فقیرانہ آئے صدا کر چلے	میر تقی میرؔ	03-05
2۔ گدا دست اہلِ کرم دیکھتے ہیں	مرزا محمد رفیع سوداؔ	06-07
3۔ تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا	خواجہ میر دردؔ	08-09
4۔ کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم	شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ	10-11
5۔ جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی	شیخ امام بخش ناسخؔ لکھنوی	12-13
6۔ حُسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا	خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی	14-15
7۔ وقتِ پیری شباب کی باتیں	شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ	16-17
8۔ دردمنّت کشِ دوا نہ ہوا	مرزا اسداللہ خاں غالبؔ	18-19
9۔ وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا	مومن خاں مومنؔ	20-22
10۔ لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں	بہادر شاہ ظفرؔ	23-24
11۔ سبق ایسا پڑھا دیا تو نے	مرزا داغؔ دہلوی	25-26
12۔ تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں	شادؔ عظیم آبادی	27-28
13۔ کارگاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے	یاسؔ یگانہ چنگیزی	29-30

منظومات

14۔ روٹیاں	نظیرؔ اکبرآبادی	33-35
15۔ اولوالعزمی	محمد حسین آزادؔ	36-38
16۔ جلوۂ دربارِ دہلی	اکبرؔ الہ آبادی	39-41
17۔ شعاعِ اُمید	محمد اقبالؔ	42-44
18۔ میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا	سیمابؔ اکبرآبادی	45-47
19۔ وطن کو ہم ، وطن ہم کو مبارک	برج نرائن چکبستؔ لکھنوی	48-50
20۔ جشنِ آزادی	مخمورؔ دہلوی	51-54
21۔ دیش سنگار	نذیرؔ بنارسی	55-57
22۔ اتّحاد	جاں نثار اخترؔ	58-61
23۔ سرراہ گزارے	اخترؔ الا یمان	62-64

رباعیات

24۔ دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے	میر ببر علی انیسؔ	67-69
25۔ ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا ہے جان کے ساتھ کام انسان کے لیے	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	70-72
26۔ ہر بات پہ منہ تیرا اترتا کیوں ہے؟ افسوس ہے، اے جی کے گنوانے والو!	جوشؔ ملیح آبادی	73-75

گیت

27۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے	شادؔ عارفی	78-80

غزليات

غزل

''غزل'' کا روایتی مفہوم ہے محبوب سے باتیں کرنا یا عورتوں سے باتیں کرنا۔ عام طور پر غزل میں حسن و عشق کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں، لیکن اس میں شروع سے ہی دوسرے مضامین بھی داخل ہوتے گئے۔ اب غزل میں تقریباً ہر طرح کی باتیں بیان ہوتی ہیں۔ فلسفیانہ باتیں، سیاسی واقعات، مسائل، عام انسان کی زندگی کے درپیش تجربے، تصوف کے مضامین، یہ سب غزل کے اشعار میں جگہ پا سکتے ہیں۔ غزل آج بھی اردو کی مقبول صنفِ سخن ہے اور اس کے شائقین میں عام لوگوں کی اکثریت ہے۔ اِس کا ہر شعر مفہوم کے اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے۔

اپنی ہیئت کے لحاظ سے یہ ایک انوکھی صنف ہے۔ اردو سے پہلے فارسی میں غزل کی صنف نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی۔ قدیم عربی شاعری میں قصیدے کے ابتدائی اشعار میں بعض شعر عشقیہ یا بہاریہ ہوتے تھے۔ قصیدے کا پہلا حصّہ ''تشبیب'' کہلاتا ہے۔ رفتہ رفتہ تشبیب کے اشعار آزادانہ بھی کہے جانے لگے۔ اس طرح ایک نئی صنف غزل وجود میں آئی۔

جس طرح غزل میں مضامین کی قید نہیں ہے اسی طرح اشعار کی تعداد بھی مقرّر نہیں۔ عام طور پر غزل میں پانچ یا سات شعر ہوتے ہیں۔ لیکن بعض غزلوں میں اس سے زیادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ہی ردیف و قافیے میں شاعر ایک سے زیادہ غزلیں کہہ دیتا ہے۔ ایسی غزلوں کو 'دوغزلہ'، 'سہ غزلہ'، 'چہار غزلہ' وغیرہ کہا جاتا ہے۔

غزل کا پہلا شعر ''مطلع'' کہلاتا ہے۔ جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مطلعے کے بعد دوسرا مطلع بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو ''حُسنِ مطلع'' کہتے ہیں۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلّص استعمال کرتا ہے۔ اس شعر کو ''مقطع'' کہتے ہیں۔ غزل کا سب سے اچھا شعر ''بیت الغزل'' یا ''شاہ بیت'' کہلاتا ہے۔ جس غزل میں ردیف نہ ہو اور صرف قافیے ہوں وہ ''غیر مردّف'' کہلاتی ہے۔ جس بحر، ردیف اور قافیہ کے تحت غزل کہی جاتی ہے، اسے غزل کی ''زمین'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

میر تقی میرؔ

(1722 – 1810)

میر تقی میرؔ آگرہ (اکبرآباد) میں پیدا ہوئے۔ وہ دس برس کے تھے جب ان کے والد محمد علی عرف علی متّقی کا انتقال ہوگیا۔ لہٰذا وہ آگرہ سے دہلی منتقل ہوگئے۔ اپنے سوتیلے ماموں اور اُردو فارسی کے معروف عالم سراج الدین علی خانِ آرزوؔ کے ساتھ قیام رہا اور اُن سے علمی و ادبی فیض اُٹھایا۔ دہلی ہی میں ان کی ملاقات سید سعادت علی امروہوی سے ہوئی جنھوں نے میرؔ کو اُردو میں شعر گوئی کی طرف راغب کیا۔ 1782 میں نواب آصف الدولہ کی دعوت پر وہ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

میرؔ بہت پُرگو شاعر تھے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں شعر کہے ہیں۔ اُردو میں ان کے چھے دیوان ہیں۔ انھوں نے غزل کے علاوہ بہت اعلیٰ درجے کی مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ میرؔ کی عظمت اور شاعرانہ کمال کا اعتراف سب نے کیا ہے۔

میرؔ کے غزلیہ اشعار کا سب سے بڑا وصف اثرانگیزی ہے، جذبات اور احساسات کے بیان پر میرؔ کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی زبان میں سادگی اور بے تکلفی بہت ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی روایتی غزل گویوں کے مقابلے میں بڑا مختلف ہے۔

غزل

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں! خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

کٹی عمر در بندِ فکر غزل
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میؔر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

(میر تقی میؔر)

مشق

سوالات

1۔ 'فقیرانہ آئے صدا کر چلے' اس سے کیا مراد ہے؟

2۔ شاعر نے کس وعدے کو وفا کرنے کی بات کہی ہے؟

3۔ شاعر کی آرزو کا انجام کیا ہوا؟

4۔ میؔر نے اپنے شاعرانہ کمال کے متعلق کیا کہا ہے؟

5۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا　　　ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

مرزا محمد رفیع سوداؔ

(1713–1781)

سوداؔ دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ بچپن ہی سے ذہین اور موزوں طبع تھے۔ کچھ مدّت تک شاہ حاتم کے شاگرد رہے۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک اہم شاعر تسلیم کیے گئے۔ سوداؔ کو کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔

سوداؔ کی شاعری کا شہرہ سُن کر نواب شجاع الدّولہ نے انھیں لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ حالات نے بھی انھیں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے پر مجبور کر دیا، وہاں نواب شجاع الدّولہ اور ان کے بیٹے نواب آصف الدّولہ کے زمانے میں خاطرِ خواہ پذیرائی ہوئی۔ تقریباً ستّر برس کی عمر میں لکھنؤ میں اِنتقال کیا۔

سوداؔ مزاجاً قصیدے کے شاعر ہیں، لیکن اُن کی غزلیں بھی زبان و بیان کی دل آویزی اور لب و لہجے کے بانکپن کی وجہ سے الگ پہچانی جاتی ہیں۔ غزل میں سوداؔ کا رنگ میرؔ سے بہت مختلف ہے۔ ان کے لہجے میں انفرادیت، اشعار میں مضامین کی رنگارنگی بھی نمایاں ہے۔ داخلی تجربوں کے بیان میں بھی سوداؔ بہت کامیاب ہیں۔ اُن کا ایک مخصوص انداز ہے جس میں دردمندی کی جگہ شوخی، سوز و گداز کی جگہ نشاط، اور سادگی کی جگہ پُرکاری نمایاں ہے۔ اُن کی وہ نظمیں بھی، جن میں زمانے کی بدحالی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، بہت مشہور ہیں۔

غزل

گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں	ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے	سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں
یہ رنجش میں ہم کو ہے بے اختیاری	تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں
حباب لب جو ہیں اے باغباں ہم	چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے	جو کچھ دوست اپنے میں ہم دیکھتے ہیں
مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودؔا
اُسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

(مرزا محمد رفیع سودؔا)

مشق

سوالات

1۔ اپنا دم اور قدم دیکھنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
2۔ شاعر نے باغباں کو مخاطب کر کے کیا کہا ہے؟
3۔ شاعر نے اپنی بے اختیاری کی بات کیوں کی ہے؟
4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے	جو کچھ دوست اپنے میں ہم دیکھتے ہیں

خواجہ میر دردؔ

(1721–1785)

خواجہ میر دردؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب خود ایک اچھّے شاعر تھے۔ دردؔ کے گھرانے میں خاص علمی وروحانی ماحول تھا۔ اس ماحول میں خداترسی، قناعت، توکل بے نیازی اور سادہ زندگی تھی۔ دردؔ کو تصوف کا یہ ماحول ورثے میں ملا۔ دردؔ خود بھی سادہ مزاج اور قناعت پسند تھے۔ وہ دہلی کی تباہی کے دنوں میں بھی دہلی چھوڑ کر کہیں نہیں گئے جب کہ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے شعرا کی اکثریت دوسرے شہروں کا رُخ کر رہی تھی۔

دردؔ کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی غزل میں خیالات کی پاکیزگی، زبان کی سادگی اور اثر وروانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

دردؔ نے چھوٹی بحروں میں بہت رواں اور پُر اثر غزلیں کہی ہیں۔ ان کے بہت سے شعر ضرب المثل ہیں۔

غزل

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا　　برابر ہے، دنیا کو دیکھا، نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ　　کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بے گانگی میں　　کوئی دوسرا اور ایسا، نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں　　کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے، یہ کچھ دن دکھائے　　ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا، نہ دیکھا

شب و روز اے دردؔ! درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

(خواجہ میر دردؔ)

مشق

سوالات

1۔ دردؔ نے غزل کے مطلع میں کیا بات کہی ہے؟
2۔ شاعر اپنے دل کے متعلق کیا کہنا چاہتا ہے؟
3۔ شاعر نے محبوب کو یگانہ کیوں کہا ہے؟
4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

تغافل نے تیرے، یہ کچھ دن دکھائے　　ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا، نہ دیکھا

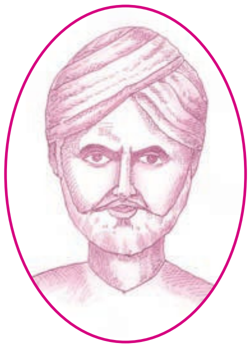

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

(1749–1824)

مصحفی امروہہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نواب ٹانڈہ (ضلع بریلی) کے یہاں ملازم ہوگئے۔ لیکن دو ایک برسوں ہی میں نواب کے انتقال کے باعث یہ ملازمت چھوٹ گئی۔ کچھ دن لکھنؤ میں گزار کر دہلی چلے آئے۔ قریب بارہ سال تک دہلی میں رہے لیکن اطمینان نصیب نہ ہوا۔ معاشی اعتبار سے خاصے پریشان رہے۔ بالآخر 1784 میں دوبارہ لکھنؤ چلے آئے اور 75 سال کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔

اِن ساری الجھنوں اور پریشانیوں کے باوجود مصحفی شعروسخن کی آبیاری کرتے رہے اور اردو کے آٹھ دیوان مرتب کیے۔ اس کے علاوہ فارسی کا ایک دیوان بھی تیار کیا۔ اردو شعرا کے تین تذکرے بھی ان کی یادگار ہیں۔ شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں قابل قدر کارنامے انجام دیے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے، جن میں خواجہ حیدر علی آتش قابل ذکر ہیں۔

مصحفی کے کلام میں اتنی گہرائی اور مضامین میں اتنا پھیلاؤ نہیں ہے جتنا میر تقی میر کے یہاں ہے، لیکن مصحفی کو زندگی اور خاص کر عشق کے متنوع تجربات کو بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ مصحفی کے بہت سے شعروں میں بے ساختگی کے عنصر نے ایک خاص اثر انگیزی پیدا کر دی ہے۔ انھوں نے انوکھے اور نئے مضامین بھی خوب صورتی کے ساتھ باندھے ہیں۔ شوخی کا پہلو بھی ان کے اشعار کی ایک نمایاں خوبی ہے۔

غزل

کیا کریں جاکے گلستاں میں ہم　　آگ رکھ آئے آشیاں میں ہم
جانتے آپ سے جدا تجھ کو　　کرتے گر فرق جسم و جاں میں ہم
شاخِ گل کے گلے سے مِل مِل کر　　روتے ہیں موسمِ خزاں میں ہم

مصحفؔی عشق کرکے آخر کار
خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

(شیخ غلام ہمدانی مصحفؔی)

مشق

سوالات

1۔ مصحفؔی نے گلستاں میں نہ جانے کی کیا وجہ بتائی ہے؟
2۔ جسم وجاں میں فرق کرنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
3۔ شاعر موسم خزاں میں شاخِ گُل سے گلے مل کر کیوں رو رہا ہے؟
4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

مصحفؔی عشق کر کے آخر کار　　خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی

(1773–1838)

ناسخ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ناسخ کو علم وادب کے علاوہ سپاہیانہ فنون سے بھی دل چسپ تھی، لیکن وہ ان چیزوں سے زیادہ اپنی استادی کے لیے مشہور ہوئے۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ناسخ نے زبان اور فن میں بہت سی اصطلاحیں رائج کیں۔ ناسخ کو زمانے کے حالات سے مجبور ہو کر لکھنؤ سے کئی بار نکلنا پڑا۔ لیکن آخری ایّام لکھنؤ میں بڑی عزّت اور شہرت سے گزرے۔

ناسخ کو لکھنوی رنگِ سخن کا اُستاد تسلیم کیا گیا ہے، خیال بندی اور مضمون آفرینی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام میں مختلف صنعتوں، خاص طور پر رعایت لفظی کا استعمال زیادہ ہے۔

ناسخ کی شاعری کو عام طور پر بے رنگ اور بے اثر کہا گیا ہے۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کا وہ انداز اپنایا جسے ''خیال بندی'' اور ''مضمون آفرینی'' کہتے ہیں۔ ناسخ کا یہ انداز ان کے زمانے میں مقبول ہوا۔ ممکن ہے کہ غالبؔ نے بھی ناسخ کا تھوڑا بہت اثر قبول کیا ہو، لیکن چوں کہ ناسخ نئ اور بھونڈی بات میں فرق نہ کر سکتے تھے اس لیے ان کا زیادہ تر کلام بے مزہ معلوم ہوتا ہے، پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ ناسخ کو نظر انداز کرنا ممکن ہو۔ ان کی بہترین شاعری اردو ادب کے سرمائے کا قیمتی حصّہ ہے۔

غزل

جُنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
اگر چہ آئی ہے برسات پھول پھولے ہیں
ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی
کہاں امید ترقی ہے جیتے جی برسوں
یہ مشت خاک ہے بس منتظر بگولوں کی
جو چشم اہل وطن میں نہ ٹھہرے کیا پروا
ہماری خاک سے روشن ہیں آنکھیں غولوں کی

نجاتِ ناسخِ عاصی بھی کیجیو مولا!
تمھیں تو امتیں بخشو گے سب رسولوں کی

(شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی)

مشق

سوالات

1۔ ناسخ نے غزل کے مطلع میں کیا بات کہی ہے؟

2۔ شاعر برسات کے موسم سے لطف اندوز کیوں نہ ہوسکا؟

3۔ مشتِ خاک کا کیا مطلب ہے؟

4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

جو چشم اہل وطن میں نہ ٹھہرے کیا پروا
ہماری خاک سے روشن ہیں آنکھیں غولوں کی

خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی

(1777–1847)

آتشؔ کے بزرگ بغداد سے ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش دہلی سے فیض آباد منتقل ہوگئے۔ آتشؔ کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی۔ کم عمری ہی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اس لیے ان کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی، البتہ عربی، فارسی کی کچھ تعلیم انھوں نے گھر پر حاصل کی۔ آتشؔ نے اپنی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت کے باعث مقبولیت حاصل کی اور نواب محمد تقی خاں کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ پھر انھیں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور مستقل یہیں رہے۔ انھوں نے عمر کا بڑا حصہ تنگ دستی کی حالت میں بسر کیا لیکن طبیعت کی قلندری اور بانکپن نہ گیا۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ آخر عمر میں آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔

آتشؔ کی غزل میں روز مرہ کے بے تکلف اور برجستہ استعمال سے گفتگو اور مکالمے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ صاف اور شستہ زبان کو فن کارانہ انداز میں برتنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی غزل کی ایک منفرد اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف وہ حسنِ محبوب کے بیان میں شوخی اور رنگینی سے کام لیتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے سنجیدہ موضوعات اور تصوف و معرفت کے مضامین کو شعر میں سنجیدگی اور درویشانہ سرشاری کی کیفیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان امتیازی خصوصیات کی بنا پر ان کا شمار اُردو کے ممتاز غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ آتشؔ کی غزل اپنے لہجے کی بانکپن اور خود اعتمادی سے بھی پہچانی جاتی ہے۔

غزل

حُسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

وہ یاد ہے اس کی کہ بھلادے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا

آوارگیِ نکہت گل کا ہے اشارہ!
جامہ سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اس کا

یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اس کا

شکرانۂ ساقی ازل کرتا ہے آتؔش
لبریز مے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

(خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی)

مشق

سوالات

1۔ شاعر نے ہشیار کس کو کہا ہے؟

2۔ محبوب کی یاد کا شاعر پر کیا اثر ہو رہا ہے؟

3۔ شاعر کے نزدیک محبوب کی کیا قدر و قیمت ہے؟

4۔ نکہت گل کی آوارگی سے کیا مراد ہے؟

5۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اس کا

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

(1789–1854)

ذوقؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں ساری زندگی گزار دی۔ وہ ایک سپاہی کے بیٹے تھے۔ ان کی باقاعدہ تعلیم تو نہ ہوئی لیکن انھوں نے اپنی ذہانت اور محنت کے ذریعے بہت لیاقت پیدا کر لی تھی۔ ابتدا میں وہ شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہوئے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی راہ الگ کر لی۔ اُنیس برس کی عمر میں شاہی قلعے سے ان کا تعلق قائم ہوا۔ بہادر شاہ ظفرؔ 1837 میں بادشاہ ہوئے تو انھوں نے ذوقؔ کو ''ملک الشّعرا'' اور ''خاقانیِٔ ہند'' کے خطابات عطا کیے۔

ذوقؔ کی غزلوں میں خیالات و جذبات کی پیچیدگی یا گہرائی نہیں ہے۔ پھر بھی اُن کے بہت سے اشعار زندگی کی ایسی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں کہ وہ زبان زدِ عام ہو گئے ہیں۔

جہاں تک زبان کے صاف اور صحیح ہونے کا سوال ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذوقؔ کی زبان مُستند ہے، قصیدے میں ذوقؔ کا مرتبہ بہت اُونچا ہے۔ غزل میں ذوقؔ کا سب سے بڑا امتیاز ان کا روز مرّہ اور بامحاورہ زبان کا استعمال ہے۔ ان کے مطلعے بھی بہت مشہور ہیں۔ جذبات کی ترجمانی اور زبان پر اپنی قدرت کے لحاظ سے وہ اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔

غزل

وقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا اُدھر، دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں
حرف آیا جو آبرو پہ مری ہیں یہ چشمِ پُر آب کی باتیں
مجھ کو رسوا کریں گی خواب اے دل یہ تری اضطراب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

(شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ)

مشق

سوالات

1۔ شاعر نے وقت پیری شباب کی باتوں کو خواب کی باتیں کیوں کہا ہے؟
2۔ دلِ خانہ خراب سے کیا مراد ہے؟
3۔ شاعر کی آبرو پہ حرف کیوں آیا؟
4۔ شاعر نے اپنی رسوائی کا سبب کیا بتایا ہے؟
5۔ ذوقؔ مقطع میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

(1797-1869)

مرزا غالبؔ اکبرآباد میں پیدا ہوئے تھے لیکن زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گزارا۔ غالبؔ اردو، کے سب سے مشہور کلاسیکی شاعر ہیں۔ انھوں نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔ غالبؔ نے نثر نگاری کا آغاز فارسی سے کیا اور عمر کے آخری حصّے میں اردو نثر کی جانب متوجہ ہوئے۔

نثر میں ان کا بڑا کارنامہ ان کے خطوط ہیں جن میں انھوں نے بات چیت کا انداز اختیار کیا ہے۔ غالبؔ کے اردو خطوط میں ان کی اپنی زندگی اور زمانے کے بہت سے دل چسپ حالات و واقعات سمٹ آئے ہیں۔

غالبؔ کی شاعری اپنے آفاقی پہلو اور انسان دوستی کے اعتبار سے ایک علاحدہ شان رکھتی ہے۔ وہ باقاعدہ فلسفی تو نہیں تھے مگر ان کے شعروں میں فکر کی بلندی اور رنگارنگی کا عنصر نمایاں ہے۔ انھوں نے بہت پیچیدہ شعر بھی کہے ہیں اور بہت آسان بھی۔ دنیا کو دیکھنے کا ان کا اپنا انداز ہے۔ کسی بھی بات کو وہ آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتے۔ ان کی عظمت کا اعتراف ہر دور میں کیا گیا ہے۔ غالب کے کلام کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

غزل

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھّا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

(مرزا اسداللہ خاں غالبؔ)

مشق

سوالات

1۔ ’میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا‘ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ رقیبوں کو جمع کرنا تماشے کا باعث کیوں ہے؟

3۔ شاعر کو گھر میں بوریا نہ ہونے کا ملال کیوں ہے؟

4۔ نمرود کی خدائی کہنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

5۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مومن خاں مومنؔ

(1800–1852)

مومنؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ خاندانی سلسلہ کشمیر سے تھا۔ والد کا نام حکیم غلام نبی کشمیری تھا۔ خاندانی پیشہ طبابت تھا، لیکن مومنؔ کو طب کے علاوہ دوسرے بہت سے علوم اور فنون مثلاً منطق، نجوم، ریاضی اور شطرنج میں بھی مہارت حاصل تھی۔ مومنؔ اپنے زمانے کے ذہین ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں فارسی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ان کا فارسی کلام بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی اُنھیں کمال حاصل تھا۔

مومنؔ کی شاعری بہت خوب صورت لیکن محدود موضوعات کی حامل ہے۔ ان کے اکثر اشعار بہت مشکل ہیں کیوں کہ وہ اشاروں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ مومنؔ کے کلام میں زبان و بیان کا خاص رچاؤ ہے۔

مومنؔ کی شاعری میں تغزل کا عنصر حاوی ہے۔ مومنؔ کے اس رنگ کی پیروی بعد میں بھی کی گئی۔ مولانا حسرتؔ موہانی کا مشہور شعر ہے:

طرزِ مومنؔ میں مرحبا حسرتؔ
تیری رنگیں بیانیاں نہ گئیں

غزل

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی ایسی بات اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بُری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(مومن خاں مومنؔ)

مشق

سوالات

1۔ مومنؔ مطلع میں کس وعدے کو یاد دلا رہے ہیں؟

2۔ شاعر کو ذرا ذرا کون سی باتیں یاد آ رہی ہیں؟

3۔ شاعر نے بیان سے پہلے کس بات کو بھلانے کو کہا ہے؟

4۔ شعر کی تشریح کیجیے:

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بہادر شاہ ظفرؔ

(1775–1862)

سراج الدین محمد بہادر شاہ نام اور ظفرؔ تخلّص تھا۔ ابوظفر ان کا تاریخی نام ہے۔ تعلیم و تربیت لال قلعہ ہی میں ہوئی۔ انھوں نے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا اور پنجابی میں ان کا کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان زبانوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔

ظفرؔ نے ابتدا میں شاہ نصیرؔ سے اصلاح لی، لیکن شیخ ابراہیم ذوقؔ کو ''استادشاہ'' کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد وہ غالبؔ سے اصلاح لینے لگے۔ ظفرؔ نے شاہ نصیرؔ سے متاثر ہو کر مشکل زمینوں میں چند غزلیں کہی ہیں۔ ظفرؔ کا اپنا انداز ہے جو ان استادانِ فن سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں قلعہ معلّٰی کی پاکیزہ زبان، دہلی کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔ ان کے کلام میں فارسی تراکیب کا استعمال برائے نام ہے۔ انھوں نے بیشتر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں کے علاوہ سلام، مرثیہ، مجرا، شہر آشوب، رباعی، قطعہ، سہرا، دوسرے صنفوں کے ساتھ ساتھ گیت، بھجن، ٹھمری اور دوہے بھی ان کے کلیات میں شامل ہیں۔ ظفرؔ کی شاعری میں فارسی اثرات کم سے کم اور اردو پن زیادہ سے زیادہ ہے۔

ظفرؔ نے اردو میں چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ جو بعد میں ''کلیاتِ ظفرؔ'' کے نام سے ایک ساتھ شائع ہوئے۔

غزل

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں

بلبل کو آشیاں سے نہ صیاد سے گِلہ
قسمت میں قید تھی لکھی فصلِ بہار میں

کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جابسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

اک شاخِ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادماں
کانٹے بچھا دیے ہیں دلِ لالہ زار میں

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفؔر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(بہادر شاہ ظفؔر)

مشق

سوالات

1۔ اجڑے دیار سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ کس کی بنی ہے عالم ناپائدار میں، اس کا کیا مطلب ہے؟

3۔ حسرتوں کے تعلق سے کیا بات کہی گئی ہے؟

4۔ شاعر نے زندگی کے دن کس طرح بسر کیے؟

5۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

اک شاخِ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادماں   کانٹے بچھا دیے ہیں دلِ لالہ زار میں

مرزا داغؔ دہلوی

(1831–1905)

مرزا خاں نام، داغؔ تخلّص تھا۔نواب شمس الدّین احمد خان رئیس لوہارو کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، لال قلعے میں پرورش پائی۔ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ 1857 کے بعد رام پور چلے گئے۔ 1888 میں حیدرآباد پہنچے۔ میر محبوب علی خاں آصف جاہ اُن کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے اپنے استاد داغؔ دہلوی کو'ناظم یار جنگ'، 'دبیرالدّولہ'، 'فصیح الملک' کا خطاب عطا کیا اور گراں قدر وظیفہ مقرّر کیا۔ داغ نے آخر دم تک عزّت ووقار کی زندگی بسر کی۔

داغؔ کو دہلی کی زبان اور محاورے پر قدرت حاصل تھی۔ وہ روزمرّہ کے استعمال کا خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اُردو زبان کی باریکیوں کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ داغؔ کی زبان دانی کا دبدبہ اتنا تھا کہ اس زمانے کے بہت سے شاعروں نے ان سے اصلاح لی۔ علامہ اقبالؔ نے بھی اپنا ابتدائی کلام داغؔ کو دکھایا تھا اور وہ داغؔ سے اس تعلق پر فخر کرتے تھے۔ زبان کے مزے اور بیان کی شوخی کے لحاظ سے داغؔ ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کا مذاق عام کرنے میں داغؔ کا رول بہت نمایاں ہے۔ ان کی جیسی شہرت اور مقبولیت کسی اور شاعر کو نہیں ملی۔ سامنے کی باتیں اور مضامین وہ سہل، سادہ اور عام بول چال کی زبان میں بہت خوبی کی ساتھ باندھتے ہیں۔اس لیے داغؔ کے اشعار بآسانی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔

ان کے کلام کے مجموعے 'گلزارِداغؔ'، 'آفتابِ داغؔ'، 'فریادِداغؔ'، 'مہتابِ داغؔ' اور 'یادگارِداغؔ شائع ہو چکے ہیں۔

غزل

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے　　دل سے سب کچھ بُھلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے　　دلِ بے مدّعا دیا تو نے
نارِ نمرود کو کیا گلزار　　دوست کو یوں بچا لیا تو نے
کہیں مشتاق سے حجاب ہوا　　کہیں پردہ اٹھا دیا تو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب　　نقش اپنا جما دیا تو نے

داغؔ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

(مرزا داغؔ دہلوی)

مشق

سوالات

1۔ دلِ بے مدعا سے کیا مراد ہے؟
2۔ نقشِ باطل مٹنے کا کیا انجام ہوا؟
3۔ داغؔ نے اس غزل میں خدا کی کن کن عنایات کا ذکر کیا ہے؟
4۔ شعر کی تشریح کیجیے:

نارِ نمرود کو کیا گلزار　　دوست کو یوں بچا لیا تو نے

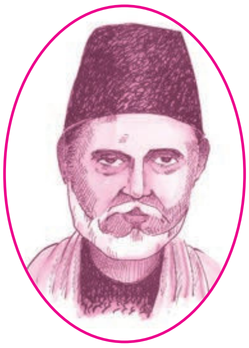

شاؔد عظیم آبادی

(1846–1927)

علی محمد شاؔد کے والد سیّد عباس مرزا الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ وہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے۔ جہاں شاؔد عظیم آبادی پیدا ہوئے۔ تعلیم گھر ہی پر ہوئی جس کا سلسلہ چار سال کی عمر سے شروع ہوگیا تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصے تک شاؔد نے انگریزی بھی پڑھی۔ اپنی ذاتی لیاقت اور اساتذہ کی تربیت سے اردو، فارسی اور عربی زبانوں نیز مذہبی علوم اور فنِ شعر میں بھی مہارت حاصل کی۔ ان کا شمار دورِ جدید کے اہلِ علم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے 1891 میں انھیں خان بہادر کا خطاب دیا۔

شاؔد نے نثر و نظم دونوں میں کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ شاؔد کی غزلوں کا دیوان ان کی وفات کے بعد ''نغمۂ الہام'' کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ان کی خودنوشت ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' اور متعدد مجموعے بھی منظر عام پر آئے۔

شاؔد نے غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی شہرت کا باعث اُن کی غزلیں ہیں۔ شاؔد کا کلام سادگی اور گھلاوٹ، ترنم و شیرینی، کیف و سرور اور تازگی و تاثیر کے باعث لائق توجّہ ہے۔ زبان کی صفائی و سادگی شاؔد کی شاعری کا خاص وصف ہے۔

غزل

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچے کے ہر ذرّہ سے آگاہ — اِدھر سے مدّتوں آیا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم — میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا — بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاؔد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

(شاؔد عظیم آبادی)

مشق

سوالات

1۔ کھلونے دے کے بہلانے سے کیا مراد ہے؟
2۔ شاعر اس کوچے کے ہر ذرّہ سے آگاہ کیوں ہے؟
3۔ 'میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں' کا کیا مطلب ہے؟
4۔ اعجازِ مے کا معتقد ہونے سے کیا مراد ہے؟
5۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

کجا میں اور کجا اے شاؔد دنیا — کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

یاسؔ یگانہ چنگیزی

(1884–1956)

مرزا واجد حسین نام تھا، پہلے یاسؔ پھر یگانہ تخلّص اختیار کیا اور یاس یگانہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ پٹنہ میں پیدا ہوئے، یہیں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ 1904 میں کلکتہ گئے، وہاں بیماری نے طول کھینچا تو علاج کے لیے لکھنؤ آئے، اور لکھنؤ ہی میں شادی کی پھر یہیں رہائش اختیار کرلی۔ لکھنؤ کا قیام نہایت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ اس کے اثرات ان کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ کئی معاصرین سے ان کے معرکے رہے۔ زندگی کے آخری ایاّم افسوس ناک بحثوں اور تلخیوں کی نذر ہوئے۔

ان کی شخصیت میں انانیت بہت زیادہ تھی۔ کلام میں قوت اور زور ہے۔ بانکپن اور آزادہ روی ان کے مزاج کا حصّہ ہے۔ ان کی غزل میں فکر کی تازگی اور احساس کی جدّت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں شخصیت کی آزادی کی چمک نمایاں ہے۔ انھوں نے عام بول چال کے الفاظ کا استعمال بامعنی انداز میں کیا ہے۔ یگانہ کی رباعیاں بھی مشہور ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعے ’’آیاتِ وجدانی‘‘ اور ’’گنجینہ‘‘ کے نام سے شائع ہوئے۔

غزل

کار گاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

بے دلوں کی ہستی کیا جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے

کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرتِ خدا ہوں میں
میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

کیمیائے دل کیا ہے خاک ہے مگر کیسی
لیجیے تو مہنگی ہے بیچیے تو سستی ہے

خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلے کی پستی ہے

دیدنی ہے یاسؔ اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

(یاسؔ یگانہ چنگیزی)

مشق

سوالات

1۔ یاسؔ نے مطلع میں دنیا کے بارے میں کیا کہا ہے؟
2۔ شاعر نے بے دلوں کی زندگی کو کس چیز سے مثال دی ہے؟
3۔ شاعر اپنی خود پرستی کو حق پرستی کیوں سمجھتا ہے؟
4۔ شاعر نے کیمیائے دل کی کیا خصوصیت بیان کی ہے؟
5۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلے کی پستی ہے

منظومات

نظم

نظم کے معنی 'انتظام، ترتیب یا آرائش' کے ہیں۔ نظم شاعری کی ایسی صنف ہے جس میں کسی خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

نظم کے لیے نہ تو ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ غزل اور مثنوی کی ہیئت میں بھی نظمیں کہی گئی ہیں۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم کی چار قسمیں ہیں:

1۔ پابند نظم

ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترتیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔

2۔ نظم معرّا

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے برابر ہوں مگر ان میں قافیے کی پابندی نہ ہو، نظمِ معرّا کہلاتی ہے۔

3۔ آزاد نظم

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی جاتی ہے، نہ مصرعے برابر ہوتے ہیں تاہم بحر کی پابندی کی جاتی ہے۔

4۔ نثری نظم

نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں نہ تو ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی وزن کی۔ نثری نظم کا رواج دُنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔ اردو میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ یوں پرانی وضع کے بہت سے لوگ اسے شاعری کی صنف کے طور پر اب بھی تسلیم نہیں کرتے۔

نظیرؔ اکبر آبادی

(1740–1830)

نظیرؔ کا پورا نام ولی محمد تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں اکبر آباد (آگرہ) چلے گئے اور اکبر آباد کو اپنا وطن بنا لیا۔ وہ گھر گھر جا کر بچّوں کو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے بہت سادگی اور قلندری کے ساتھ زندگی بسر کی۔

نظیرؔ اکبر آبادی سے اردو میں عوامی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ انھوں نے عوام کی زندگی کے سکھ دکھ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور انھی کی زبان کا استعمال کیا۔

ہندوستانی موسم، میلے، تہواروں اور انسانی زندگی کے اہم پہلوؤں اور معاملات پر لکھی ہوئی ان کی نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیرؔ کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اس لیے وہ موقع اور موضوعات کی مناسبت سے مناسب الفاظ استعمال کر کے کلام میں بلا کی تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ نظیرؔ کی شاعری میں موضوعات کی کثرت بھی نمایاں ہے۔

رواداری اور انسان دوستی کے ساتھ ساتھ نظیرؔ کا صلح کل کا رویہ بھی انھیں سماج کے ہر طبقے اور گروہ کا شاعر بناتا ہے، وہ پیچیدہ موضوعات پر بھی سیدھی سادی زبان میں شعر کہنے کا ملکہ رکھتے تھے۔

روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے   خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آگ جو جلتی حضور ہے   جتنے ہیں نور اُن میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئی پیٹ میں، سو قند گُھل گئے   گل زار پُھولے آنکھوں میں اور عیش تُل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈھل گئے   چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کُھل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو   میلے کی سَیر، خواہشِ باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو   سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کاملِ فقیر سے یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

(نظیرؔ اکبرآبادی)

مشق

سوالات

1۔ شاعر نے روٹیوں کو خاص نور کیوں کہا ہے؟
2۔ شاعر نے روٹیوں کا کیا کشف وکمال بیان کیا ہے؟
3۔ شاعر کے نزدیک روٹیاں کس طرح اللہ کی یاد دلاتی ہیں؟
4۔ فقیر کو چاند اور سورج میں ''روٹیاں'' کیوں نظر آتی ہیں؟

محمد حسین آزاد

(1829–1910)

محمد حسین آزؔاد اردو کے اہم ادیب اور شاعر تھے۔ وہ مشہور شاعر استاد ذوق کے شاگرد اور دہلی اردو اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ آخر میں وہ لاہور میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔

لاہور میں انھوں نے انجمن پنجاب کی زیرنگرانی ایک نئے انداز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی، جس میں شاعروں کو عنوانات دیے جاتے تھے اور انھیں عنوانات پر شعرا نظمیں سناتے تھے۔ یہیں سے اردو میں جدید نظم نگاری یا جدید شاعری کا آغاز ہوا۔

محمد حسین آزؔاد نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ 'آبِ حیات'، 'دربارِ اکبری'، 'نیرنگِ خیال'، 'سخن دان فارس' وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب اور انشاپرداز تھے۔ انھوں نے بچّوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق اردو میں بہت سی ریڈرس بھی لکھیں۔

انھوں نے شاعری میں نئے موضوعات شامل کرنے پر زور دیا اور ''نیچرل شاعری'' کے ایک نئے تصور کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ شاعری کو سماجی، اصلاحی اور معاشرتی تعمیر کے ایک وسیلے کے طور پر اختیار کرنے کی باضابطہ روایت بھی آزؔاد اور حالؔی سے شروع ہوتی ہے۔

اولوالعزمی

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہمت کے شہ سوار جو گھوڑے اُٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہوں گے تو سر کو جُھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اُجال دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ٹال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم
اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دورُخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

(محمد حسین آزاد)

مشق

سوالات

1۔ 'ہے سامنے کُھلا ہوا میداں چلے چلو' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ دوسرے بند میں شاعر نے کیا بات کہی ہے؟

3۔ تیسرے بند میں شاعر نے کیا مشورہ دیا ہے؟

4۔ نظم 'اولوالعزمی' کو پڑھ کر کیا تاثر پیدا ہوتا ہے؟

اکبرالہ آبادی

(1846–1921)

سیّد اکبرحسین رضوی نام، اکبؔر تخلّص تھا۔ بارہ، ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔ پہلے مکتب اور پھر جمنا مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ ملازمت کی ابتدا عرضی نویسی کی حیثیت سے کی۔ 1873 میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کے بعد سب جج اور سیشن جج مقرّر ہوئے۔

اکبؔر کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ ان کی انفرادیت طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں نظر آتی ہے۔ یہی اُن کی شہرت کا سبب بنی۔ انھوں نے شاعری کو اصلاحِ قوم کے ایک موثّر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے انگریزی تعلیم کے منفی اثرات اور انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید پر بھرپور وار کیے۔ وہ مشرقی تہذیب کے دل دادہ تھے۔ اسی لیے مذہبی اور تہذیبی روایات سے نئی نسل کی بے گانگی، نوجوانوں کی بے راہ روی، عورتوں کی بے جا آزادی خاص طور پر اکبؔر کے طنز کا نشانہ بنی۔ اکبؔر تعلیمِ نسواں کے حامی تھے۔ انھوں نے عام بول چال کے لفظوں کو نہایت دل آویز اور فن کارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ انگریزی الفاظ سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اکبؔر کا کلام 'کلیاتِ اکبرؔ' کے نام سے چار حصّوں میں شائع ہو چکا ہے۔ شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کے پس منظر میں اکبؔر کا نام سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف سب نے کیا ہے۔

جلوۂ دربارِ دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا   دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھّا دیکھا   کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا   اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا

سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا   حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا
پلٹن اور رسالے دیکھے   گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے   بینڈ بجانے والے دیکھے
خیموں کا اِک جنگل دیکھا   اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا   عزت خواہوں کا دنگل دیکھا
ڈالی میں نارنگی دیکھی   محفل میں سارنگی دیکھی

بیرنگی بارنگی دیکھی   دہر کی رنگا رنگی دیکھی
اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا   بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگر چہ لٹکا دیکھا   دل دربار سے اٹکا دیکھا
پُر تھا پہلوئے مسجدِ جامع   روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع   سب کے سب تھے دید کے طامع
سُرخی سڑک پر کٹتی دیکھی   سانس بھی بھیڑ میں گُھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی   مُفت کی دولت لٹتی دیکھی
ایک کا حصہ منّ و سلوا   ایک کا حصہ تھوڑا جلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا   میرا حصّہ دور کا جلوا
اوجِ بخت ملاقی ان کا   چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا   آنکھیں میری باقی اُن کا

(اکبرالہ آبادی)

مشق

سوالات

1۔ 'سر میں شوق کا سودا دیکھا' اس کا کیا مطلب ہے؟
2۔ اس نظم میں شاعر نے دہلی کے کن مقامات کا ذکر کیا ہے؟
3۔ نظم 'جلوۂ دربارِ دہلی' میں شاعر نے کن مناظر کی تصویر کشی کی ہے؟
4۔ 'میرا حصّہ دوُر کا جلوہ' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ

(1877–1938)

اقبالؔ کی پیدائش سیالکوٹ میں ہوئی۔ انھوں نے مولانا سید میر حسن سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ سیالکوٹ سے ہی انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور سے بی۔اے کیا۔ انھیں شاعری کا شوق لڑکپن سے تھا۔ چند غزلوں پر داغؔ دہلوی سے اصلاح لی۔ داغؔ کی شاعری کا رنگ اقبالؔ کی دوچار ابتدائی غزلوں میں نمایاں ہے۔ اقبالؔ نے 1905 میں یوروپ کا سفر کیا۔ پہلے کیمبرج گئے۔ پھر جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے ایرانی فلسفے اور تصوف پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ لندن واپس آکر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ 1908 میں ہندوستان آگئے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ 1915 میں انھوں نے اپنی مشہور فارسی نظم ''اسرارِ خودی'' میں فلسفۂ خودی کا نظریہ پیش کیا۔ 1918 میں ''رموزِ بے خودی'' کی اشاعت ہوئی۔ انگریزی حکومت نے انھیں ''سر'' کا خطاب دیا۔ اقبالؔ نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا لیکن اقبالؔ بنیادی طور پر ایک مفکر اور شاعر تھے۔

اقبالؔ نے اردو شاعری کو نئی سمت اور نئے پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ ان کے کلام میں انسانی عظمت و احترام اور حب الوطنی کا جذبہ خاص طور پر نمایاں ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں نغمگی اور ترنم بھی بہت ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو بھی ایک نیا انداز عطا کیا۔ بالِ جبریل کی غزلوں سے غزلیہ شاعری کے ایک نئے موڑ کی نشان دہی ہوتی ہے۔

''بانگِ درا'' اردو میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ اس کے بعد اردو میں ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' کے نام سے دو اور مجموعے سامنے آئے۔ ''ارمغانِ حجاز'' ان کا چوتھا مجموعہ ہے جس میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا کلام شامل ہے۔ اقبالؔ کے کلام کا بیشتر حصّہ فارسی میں ہے، انگریزی نثر میں بھی ان کی بہت سی تحریریں ہیں۔ فلسفیانہ گہرائی اور اپنے شعور کی بلندی کے اعتبار سے اقبالؔ ہماری ادبی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں، انھیں دنیا کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہمارا قومی ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' بھی اقبالؔ کا ہی لکھا ہوا ہے۔

شُعاعِ امید

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام   دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح، کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں   بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایّام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت   نے مثلِ صبا طوفِ گل ولالہ میں آرام

پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں   بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن   افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذّتِ نظّارہ سے محروم   لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپالے
اے مہر جہاں تاب نہ کرہم کو فراموش

اِک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درِ نایاب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پرُ آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بے گانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحؔر کر

(محمد اقبالؔ)

مشق

سوالات

1۔ سورج نے اپنی شعاعوں کو کیا پیغام دیا؟

2۔ 'پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے' شعاعوں نے سورج سے یہ بات کیوں کہی؟

3۔ شاعر نے شوخ کرن کی کیا خصوصیت بیان کی ہے؟

4۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر   فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سَحر کر

سیمابؔ اکبرآبادی

(1880–1925)

عاشق حسین سیمابؔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ایف اے تک ابھی تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔1897 میں تعلیم چھوڑنی پڑی ۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔سیمابؔ امتحان کے پرچوں میں فارسی اشعار کا ترجمہ بلا تکلف اردو اشعار میں کردیتے تھے۔ سیمابؔ داغؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی شاعری بلند خیالات اور انسانی جذبات کی ترجمان ہے۔ کانپور میں کچھ عرصے ملازم رہے۔ بعد میں استعفیٰ دے کرآگرہ میں اپنا ادارہ ’قصرالادب‘ قائم کیا۔سیکڑوں نوجوان ان کے شاگرد ہوئے ۔ سیمابؔ کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ کارِامروز، حکیم عجم، پیامِ فرداوغیرہ ان کے اہم مجموعے ہیں۔

انھوں نے ایک ادبی ماہنامہ ’شاعر‘ کا بھی اجرا کیا جواب تک جاری ہے۔

میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

میں ملک کی خدمت سحر وشام کروں گا
کاہل نہ بنوں گا نہ میں آرام کروں گا
جس کام میں بہبود ہو وہ کام کروں گا
ہر کام غرض قابلِ انعام کروں گا
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

میں جانتا ہوں ملک کو کیا کیا ہے ضرورت
پھر کیوں نہ کروں گا میں بھلا ملک کی خدمت
مدّت سے نہیں ہند میں مقبول تجارت
کوشش میں کروں گا کہ بڑھے صنعت وحرفت
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

میں جانتا ہوں رنج سے مغلوب وطن ہے
پیارا ہے بہت اور بہت خوب وطن ہے
سو جان سے میرا مجھے مرغوب وطن ہے
خادم میں بنوں گا مجھے محبوب وطن ہے
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

لاؤں گا بلندی پہ میں یوں اہلِ وطن کو
چھو لیں گے کبھی ہاتھوں سے سورج کی کرن کو
دوں گا میں نئے پھول ہر اک شاخِ سمن کو
فردوس بناؤں گا میں بھارت کے چمن کو
میں ملک میں لکھ پڑھ کے بہت نام کروں گا

(سیماب اکبرآبادی)

مشق

سوالات

1۔ شاعر ملک کی خدمت کس طرح کرنا چاہتا ہے؟

2۔ شاعر نے وطن سے محبت کا اظہار کس طرح کیا ہے؟

3۔ 'فردوس بناؤں گا میں بھارت کے چمن کو' اس بند میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟

4۔ اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

بِرج نرائن چکبستؔ

(1882–1926)

بِرج نرائن چکبستؔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں وکالت کرنے لگے۔ ایک مقدمے کی پیروی کے لیے رائے بریلی گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

چکبستؔ، میر انیسؔ کے اُسلوبِ شاعری سے زیادہ متاثر تھے۔ اُن کے کلام میں سادگی، سلاست، روانی اور ایک مترنّم فضا پائی جاتی ہے۔ چکبستؔ نے بھی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ وہ بعد میں حُب الوطنی کے جذبے کے تحت قومی نظمیں لکھنے لگے۔ اُن کی نظموں میں قدرتی مناظر کی عکّاسی، بیداریِ وطن کے جذبات، آزادی کی تڑپ اور دردمندی کے پہلو نمایاں ہیں۔ چکبستؔ نے احباب، بزرگوں اور قومی رہنماؤں کے مرثیے بھی لکھے ہیں اور اُن کی سیرت کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ 'صبحِ وطن' ان کے مجموعے کا نام ہے۔

'رامائن کا ایک سین' اور 'پھول مالا' ان کی معروف نظمیں ہیں۔ چکبستؔ کے شخصی مرثیے اور ان کی قومی نظمیں اردو شاعری کی روایت میں اپنی خاص حیثیت رکھتی ہیں۔

وطن کو ہم، وطن ہم کو مُبارک

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک   یہ اُلفت کا چمن ہم کو مبارک
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

جو چڑیاں صبح کو گاتی ہیں اکثر   اسی کا راگ ہے ان کی زباں پر
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وہ اک مستی کا عالم بادلوں میں   وہ پھولوں کا مہکنا جنگلوں میں
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

درختوں پر وہ چڑیوں کا چہکنا   وہ بیلے اور چمیلی کا مہکنا
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے　　　یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وہ ساون کے مہینے کی گھٹائیں　　　وہ کوئل اور پپیہے کی صدائیں
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وہ چشمے اور وہ امرت کا پانی　　　وہ گنگا اور جمنا کی روانی
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

اسی کی خاک سے لیتے ہیں محصول　　　وہی دیتا ہے غلّہ اور پھل پھول
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام　　　اسی مٹّی میں وہ کرتے ہیں آرام
وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک

(برج نرائن چکبستؔ)

مشق

سوالات

1۔ شاعر نے پیاری انجمن کسے کہا ہے؟
2۔ صبح کے وقت چڑیوں کی زبان پر کون سا راگ ہوتا ہے؟
3۔ شاعر کی نظر میں وطن کی خاک کی کیا حیثیت ہے؟
4۔ اس نظم میں جن مناظر کا بیان کیا گیا ہے، انھیں اپنے لفظوں میں لکھیے۔

مخمور دہلوی

(1901–1956)

مخمور دہلوی کا نام فضل الٰہی تھا، دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔ مخمور دہلوی کو بچپن ہی سے سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر مزاج میں قناعت تھی اس لیے سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ حالات نے انھیں دہلی سے پٹودی پہنچا دیا، جہاں وہ نواب محمد افتخار علی خاں والیِ ریاست پٹودی کے ملازم ہو گئے۔ ان کی زندگی کا بڑا وقت اسی ملازمت میں گزرا۔ 1947 میں پھر دہلی آ گئے۔

مخمور دہلوی کا اصل میدان غزل ہے۔ ان کے کلام میں رندی و سرمستی کی فضا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ کچھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ مخمور کا کلام 'کلیاتِ مخمور' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جشنِ آزادی

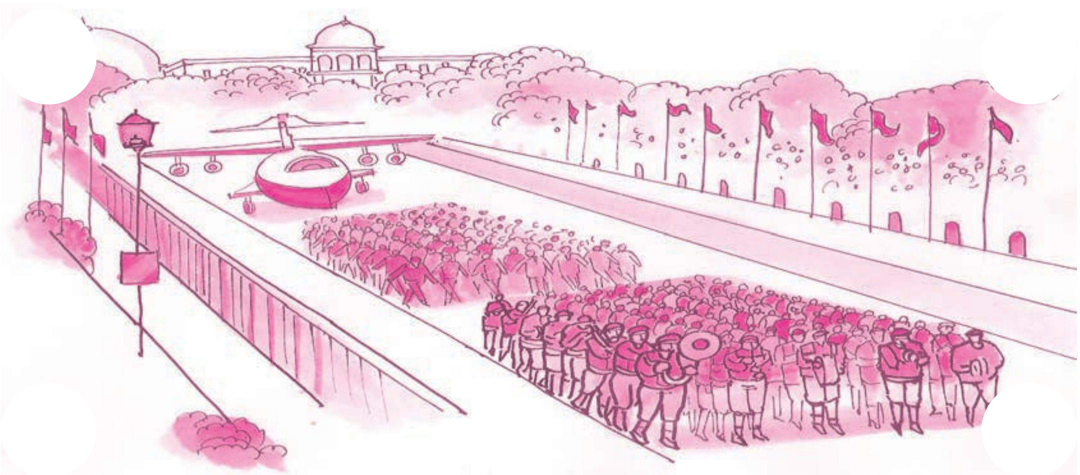

چمن میں بُلبُلیں ہر سمت چہچہاتی ہیں
فضائیں نغمۂ دِل کش ہمیں سناتی ہیں
ہوائیں آج ترانے خوشی کے گاتی ہیں
کھِلے ہیں پھول بھی، کلیاں بھی مسکراتی ہیں
بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

نشاط و عیش کا آئینہ دار آ ہی گیا
وہ زندگی کے چمن پر نکھار آ ہی گیا
وہ جس کے آنے کا تھا انتظار آ ہی گیا
وہ جھوم جھوم کے ابرِ بہار آ ہی گیا
بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

جو غم کے ساتھ تھی مہمان، وہ برات گئی
جو دن کو رات بناتی رہی، وہ رات گئی
ہجومِ یاس گیا تلخیِ حیات گئی
جُھکے نہ غیر کے آگے، نہ اپنی بات گئی
بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

چمک رہے ہیں ستارے، چراغ جل تو چکے
اندھیری رات کے سایے تمام ڈھل تو چکے
کِھلے ہیں پھول، فضاؤں کے رخ بدل تو چکے
کھٹک رہے تھے جو کانٹے وہ سب نکل تو چکے
بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

اُٹھاؤ سازِ طرب، زندگی کی بات کرو
اَلم کو دل سے بھلاؤ، خوشی کی بات کرو
اندھیرا جاچکا، اب روشنی کی بات کرو
چمن میں پھول کِھلاؤ، کلی کی بات کرو
بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

بنا ہے زینتِ دستوٗر جشنِ آزادی
ہے چشمِ شوق کو منظور جشنِ آزادی
ہوا ہوں دیکھ کے مسرور جشنِ آزادی
نظر نواز ہے مخموؔر جشنِ آزادی
بہار آئی ہے دیکھو بہار آئی ہے

(مخموؔر دہلوی)

مشق

سوالات

1۔ نظم کے پہلے بند میں شاعر نے کیا منظر پیش کیا ہے؟

2۔ ''نشاط وعیش کا آئینہ دار آہی گیا'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

3۔ ''اندھیرا جا چکا، اب روشنی کی بات کرو'' یہاں اندھیرا اور روشنی کن چیزوں کی علامت ہیں؟

4۔ نظم کے آخری بند میں شاعر نے جشنِ آزادی سے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟

نذیؔر بنارسی

(1909–1996)

پورا نام نذیؔر احمد بنارسی اور قلمی نام نذیؔر بنارسی تھا، بنارس میں پیدا ہوئے، آبائی پیشہ طبابت تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے بڑے بھائی حکیم محمد یاسین مسیح کا کلیدی رول رہا۔ جس کا ذکر وہ بار بار کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے کلام پر یادگار خاندان مصحفی منشی عبدالرازق بیتاب بنارسی سے اصلاح لی۔ 'کتابِ غزل'، 'گنگ وجمن'، 'کوثر وجم جم' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

نذیؔر نے اپنی پوری زندگی بنارس میں گزار دی۔ اس شہر کی مشترکہ تہذیب اور روایتوں سے انھیں گہرا جذباتی تعلق تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے وہ ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ ان کی شاعری میں قومیت اور مقامی موضوعات کی کارفرمائی ہے۔ ہندی اور اردو دونوں حلقوں میں انھیں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔

نذیؔر بنارسی نے عام موضوعات کو سیدھے سادے انداز میں عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں سادگی اور تاثیر نمایاں ہے۔

دیش سنگار

آؤ، امواجِ بہاراں کی طرح بَل کھائیں
کبھی کوثرَ کبھی گنگا کی طرح لہرائیں
مل کے اِس طرح محبت کے ترانے گائیں
جھوم کر مسجد و مندر بھی گلے مل جائیں
آڑ مذہب کی نہ لے کر کوئی بیداد کرے
بندگی یوں کریں ہم سب کہ خدا یاد کرے
دیش کا حسن زمانے کو دکھانا ہے ابھی
چاند تاروں کو بھی حیران بنانا ہے ابھی
مانگ چوٹی سے ہمالہ کی سجانا ہے ابھی
شمعِ کیلاش کے پربت پہ جلانا ہے ابھی
شمع وہ شمع کہ ہر گھر میں اجالا کر دے
ساری دنیا کا اندھیرا تہہ و بالا کر دے
ایک دن قسمتِ ہر اہلِ وفا بدلے گی
دل بُجھے جاتے ہیں جس سے وہ ہوا بدلے گی
جس سے شرمندہ وطن ہے وہ ادا بدلے گی
اے نذیؔر ایک نہ اک روز فضا بدلے گی
سب کے چہرے پہ ہنسی آئے گی نور آئے گا
آئے گا آئے گا، وہ دن بھی ضرور آئے گا

(نذیؔر بنارسی)

مشق

سوالات

1۔ اس نظم کے پہلے بند میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
2۔ دوسرے بند میں شاعر نے کس عزم کا اظہار کیا ہے؟
3۔ نظم کے تیسرے بند میں شاعر کن خیالات کا اظہار کر رہا ہے؟
4۔ نظم کا خلاصہ لکھیے:

جاں نثار اختؔر

(1914–1976)

سیّد جاں نثار حسین رضوی نام، اختؔر تخلّص تھا۔ آبائی وطن قصبہ خیرآباد، ضلع سیتاپور، اتّرپردیش تھا۔ لیکن جاں نثار اختؔر کی پیدائش گوالیار میں ہوئی۔ ان کے والد مضطؔر خیرآبادی اور تایا بسمؔل خیرآبادی دونوں شاعر تھے۔ انھوں نے دسویں جماعت تک تعلیم گوالیار کے وکٹوریہ کالجیئٹ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی اے کیا۔ ممبئی میں اُن کا انتقال ہوا۔

جاں نثار اختؔر نے نظمیں، غزلیں اور رباعیاں کہی ہیں۔ نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ ان کی نظمیں بہت پُر اثر ہیں۔ وطنی، قومی اور سیاسی نظموں میں ان کے جذبات اور لہجے کی لطافت نمایاں ہے۔ ’’سلاسل‘‘، ’’تارِگریباں‘‘، ’’نذرِبُتاں‘‘، ’’جاوداں‘‘، ’’گھر آنگن‘‘، ’’خاکِ دل‘‘ اور ’’پچھلے پہر‘‘ ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے فلمی گیت بھی لکھے۔ ان کی نظم ’’اتّحاد‘‘ ایک نمائندہ نظم ہے۔ جس میں انھوں نے ملک میں اتحاد، اخوّت، یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

اتّحاد

یہ دیش کہ ہندو اور مُسلم تہذیبوں کا شیرازہ ہے
صدیوں کی پُرانی بات ہے یہ، پر آج بھی کتنی تازہ ہے
تاریخ ہے اس کی ایک عمل، تحلیلوں کا ترکیبوں کا
سمبندھ وہ دو آدرشوں کا، سنجوگ وہ دو تہذیبوں کا
وہ ایک تڑپ، وہ ایک لگن، کچھ کھونے کی، کچھ پانے کی
وہ ایک طلب، دو رؤحوں کے اک قالب میں ڈھل جانے کی
وہ شمعوں کی لو پیچاں جیسے، اک شعلۂ نو بن جانے کی
دو دھاریں جیسے مدرا کی بھرتی ہوں کسی پیمانے کی
یوں ایک تجلّی جاگ اُٹھی نظروں میں حقیقت والوں کی
جس طرح حدیں مل جاتی ہوں دو سمت سے دو اُجیالوں کی
آوازۂ حق، جب لہرا کر بھکتی کا ترانہ بنتا ہے
یہ ربطِ بہم، یہ جذبِ دروُں خود ایک زمانہ بنتا ہے
چشتیؔ کا، قطبؔ کا ہر نعرہ یک رنگی میں ڈھل جاتا ہے
ہر دل پہ کبیرؔ اور تلسیؔ کے دوہوں کا فسوں چل جاتا ہے
یہ فکر کی دولت رؤحانی وحدت کی لگن بن جاتی ہے
نانکؔ کا کبت بن جاتی ہے، میرؔا کا بھجن بن جاتی ہے
دِل دِل سے جو ہم آہنگ ہوئے، اطوار ملے، انداز ملے

اک اور زباں تعمیر ہوئی، الفاظ سے جب الفاظ ملے
یہ فکر و ادب کی رعنائی، دُنیائے ادب کی جان بنی
یہ میّر کا فن، چکبستؔ کی لے، غالبؔ کا امر دیوان بنی
تہذیب کی اس یک جہتی کو اُردو کی شہادت کافی ہے
کچھ اور نشاں بھی ملتے ہیں، تھوڑی سی بصیرت کافی ہے
ٹُھمری کی رسیلی تانوں سے نغموں کی گھٹائیں آتی ہیں
چھڑتا ہے ستار اب بھی جو کہیں، خسرو کی صدائیں آتی ہیں
آپس کی یہ بڑھتی یک جہتی، اک موڑ پہ جب رُک جاتی ہے
انسان کے آگے انساں کی اک بار نظر جُھک جاتی ہے
اے ارضِ وطن! مغموم نہ ہو، پھر پیار کے چشمے پھوٹیں گے
یہ نسل و نسب کے پیمانے، یہ پیار کے درپن ٹوٹیں گے
ذہنوں کی گھٹن مٹ جائے گی، انساں کا تفکّر جاگے گا
کل ایک مکمل وحدت کا بے باک تصوّر جاگے گا
تعمیر نئی وحدت ہوگی، مانوتا کی بُنیادوں پر
اے ارضِ وطن! وشواس تو کر اک بار ہمارے وعدوں پر
اس وحدت، اس یک جہتی کی تعمیر کا دن ہم لائیں گے
صدیوں کے سنہرے خوابوں کی تعمیر کا دن ہم لائیں گے

(جاں نثار اخترؔ)

مشق

سوالات

1۔ اس نظم میں شاعر نے کن دو تہذیبوں کا ذکر کیا ہے؟

2۔ اتّحاد سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

3۔ ’’تہذیب کی اس یک جہتی کو اردو کی شہادت کافی ہے‘‘، اس مصرعے میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟

4۔ نظم کے آخری حصّے میں شاعر نے کیا امید ظاہر کی ہے؟

اخترؔ الایمان

(1915–1996)

اخترؔ الایمان، نجیب آباد، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ مدّت تک وہ دلّی کالج میں زیرِ تعلیم رہے اور دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ شروع میں محکمۂ سول سپلائی میں کام کیا، کچھ مدّت تک آل انڈیا ریڈیو میں رہے، اس کے بعد ممبئی جا کر فلموں سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی نظموں کے چھے مجموعے 'گرداب'، 'تاریک سیّارہ'، ایک منظوم تمثیل 'سب رنگ'، 'آب جو'، 'یادیں'، 'بنتِ لمحات' ، 'نیا آہنگ' شائع ہوچکے ہیں۔ ان کا کلّیات 'سروساماں' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی خودنوشت کا نام 'اس آباد خرابے میں' ہے۔ ان کے چوتھے مجموعے 'یادیں' پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔

اخترؔ الایمان کی نظموں میں ایک فلسفیانہ تجسّس کی کیفیت ملتی ہے۔ نظم نگاری میں انھوں نے اپنی راہ الگ بنائی ہے۔ نیکی اور بدی کی کش مکش، وقت کی اہمیت، خواب اور حقیقت کا تصادم اور انسانی رشتوں کی دھوپ چھاؤں اُن کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ وہ براہِ راست انداز کے بجائے رمزیہ انداز کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں خود کلامی اور مکالمے کی کیفیت ملتی ہے۔ اخترؔ الایمان اردو نظم کے ممتاز شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

سرِراہ گزارے

شبِ ماہ تو ہے، سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے، اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِراہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنھیں حُسن سے بھی لگاؤ ہے
جنھیں زندگی بھی عزیز ہے

(اختر الایمان)

مشق

سوالات

1۔ اس نظم میں شاعر کس سے مخاطب ہے؟
2۔ شاعر نے کیا کیا تشبیہیں استعمال کی ہیں؟
3۔ بہار کے دن سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
4۔ شاعر سنبھل کے چلنے کی بات کیوں کہہ رہا ہے؟
5۔ نظم کے آخر میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟

رباعيات

رُباعی

رُباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہوسکتا ہے۔ عام طور پر رُباعی کا چوتھا مصرع سب سے زیادہ زوردار ہوتا۔ قافیوں کی پابندی اور بحر کی پابندی ایسی شرطیں ہیں جن کا پورا ہونا رُباعی کے لیے لازمی ہے۔ رُباعی کے لیے چند بحریں مخصوص ہیں۔

میر ببر علی انیسؔ

(1802–1874)

میر انیسؔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق میر حسن کے خاندان سے تھا۔ میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ اعلیٰ پایے کے شاعر تھے۔ میر انیسؔ کو شاعری ورثے میں ملی۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہوا۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ ان کے والد اور اُس وقت کے ماحول نے انھیں مرثیے کی طرف متوجہ کر دیا۔ انیسؔ امجد علی شاہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔ میر انیسؔ جب لکھنؤ آئے اردو مرثیہ اُس وقت تک عروج حاصل کر چکا تھا۔ میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کم عرصے میں ہی مقبولیت حاصل کر لی۔

میر انیسؔ اصل میں مرثیے کے شاعر ہیں۔ ان کے مرثیوں میں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا رنگ نمایاں ہے۔ میر انیسؔ نے مرثیہ کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اردو میں وہ رباعیات کے بھی نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی رباعیوں میں بھی اخلاقی اقدار، فکری گہرائی اور فلسفیانہ رنگ نمایاں ہے۔

رباعی

(i)

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

(میر ببر علی انیسؔ)

مشق

سوالات

1۔ اس رباعی کا مرکزی خیال کیا ہے؟

2۔ بڑھاپا اور جوانی میں شاعر نے کیا فرق قائم کیا ہے؟

رباعی

(ii)

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

(میر ببر علی انیسؔ)

مشق

سوالات

1۔ رباعی کے پہلے شعر میں کیا کہا گیا ہے؟

2۔ 'جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے' اس کا کیا مطلب ہے؟

خواجہ الطاف حسین حالؔی

(1837–1914)

حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے ادبی ذوق کی تربیت دہلی کی ادبی مجلسوں میں ہوئی۔ وہ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ وہ ایک اچھّے شاعر، ادیب، سوانح نگار اور تنقید نگار بھی تھے۔ 1857 کے بعد وہ نواب مصطفٰے خاں شیفتؔہ سے وابستہ ہو گئے۔ شیفتؔہ کی وفات کے بعد 1872 میں لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو، پنجاب میں ملازم ہوئے۔ یہاں انگریزی کتابوں کے اردو تراجم کی اصلاح ان کے سپرد ہوئی۔ چار سال وہاں رہ کر دہلی واپس آ گئے اور اینگلو عربک اسکول میں مدرّس ہو گئے۔

سرسید کے رفقا میں حالؔی اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے سرسید کے مشن کو پورے طور پر اپنا لیا تھا۔ اپنے اسلوب اور طرزِ نگارش میں بھی انھوں نے سرسید کی پیروی کی۔ سرسید کی طرح ان کی نثر بھی سادہ اور بے تکلف ہے۔ حالؔی جتنے اچھّے نثر نگار تھے اتنے ہی اچھّے شاعر بھی تھے۔ ان کی غزلیں، نظمیں اور رباعیاں بھی بہت مقبول ہیں۔ حالؔی نے نیچرل شاعری کے فروغ میں بھی سرگرم رول ادا کیا۔ ان کی پہلی نثری تصنیف 'مجالس النسا' ہے۔ نثر نگار کی حیثیت سے حالؔی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اردو میں سوانح نگاری کے بانی ہیں۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ 'حیاتِ سعدی'، 'یادگارِ غالبؔ' اور 'حیاتِ جاوید'۔ حالؔی کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' لکھ کر اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کی بنیاد رکھی۔

رباعی

(i)

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ مُغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

(خواجہ الطاف حسین حالؔی)

مشق

سوالات

1۔ اس رباعی میں کیا بات کہی گئی ہے؟

2۔ 'دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے' اس مصرعے کا مطلب بتائیے۔

رباعی

(ii)

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لیے بنتی نہیں زندگی بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح مُردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

(خواجہ الطاف حسین حالؔی)

مشق

سوالات

1۔ شاعر کے خیال میں زندگی کس طرح بنتی ہے؟

2۔ شاعر نے اس رباعی میں کیا پیغام دیا ہے؟

جوشؔ ملیح آبادی

(1898–1982)

شبیر حسن خاں نام تھا۔ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی۔ تلاش معاش کے سلسلے میں انھوں نے حیدر آباد، دہلی اور ممبئی کا سفر کیا۔ بالآخر دارالترجمہ عثمانیہ حیدر آباد میں ملازم ہوئے۔ دہلی آ کر رسالہ 'کلیم' جاری کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک رہے۔ فلموں کے لیے گیت اور کہانیاں بھی لکھیں اور پھر سرکاری رسالہ 'آجکل' کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔

اردو شاعری میں بحیثیت نظم گو ان کا مرتبہ بلند ہے۔ جوشؔ کے کئی مجموعے شائع ہو چکے۔ ان میں 'روحِ ادب'، 'نقش و نگار'، 'شعلہ و شبنم'، 'رنگ و رامش'، 'سنبل و سلاسل' وغیرہ اہم ہیں۔

جوشؔ کی ابتدائی نظموں میں فطرت کی عکاسی ملتی ہے۔ ان نظموں پر اقبال اور ٹیگور کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ جوشؔ بعد میں رومانی اور پھر سیاسی نظمیں لکھنے لگے۔ اِسی لیے اُنھیں 'شاعرِ فطرت'، 'شاعرِ شباب' اور 'شاعرِ انقلاب' کہا جاتا ہے۔

جوش کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے تشبیہات اور صنائع کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔ ان کی نظمیں رواں دواں اور پرزور ہیں۔ نثر میں بھی جوش نے کچھ مضامین اور خودنوشت 'یادوں کی بارات' لکھی ہے۔

جوشؔ کے کلام میں ان کی رباعیات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

رباعی

(i)

ہر بات پہ منہ تیرا اترتا کیوں ہے؟
جینے کے لیے بنا ہے، مرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل، اے طفلِ حیات!
کونین خود اک کھیل ہے، ڈرتا کیوں ہے؟

(جوشؔ ملیح آبادی)

مشق

سوالات

1۔ اس رباعی کے پہلے شعر میں شاعر نے کیا بات کہی ہے۔
2۔ کونین کے بارے میں شاعر نے کیا کہا ہے؟

رباعی

(ii)

افسوس ہے، اے جی کے گنوانے والو! ہر سانس میں سو فریب کھانے والو!
غم، موجِ تبسّم سے ترس جاتا ہے بیدار ہو اے اشک بہانے والو!

(جوشؔ ملیح آبادی)

مشق

سوالات

1۔ 'جی کے گنوانے والو' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2۔ دوسرے شعر میں شاعر نے کیا مشورہ دیا ہے؟

گیت

گیت

گیت ہندی شاعری کی صنف ہے جو اردو میں بھی بہت مقبول ہے۔گیت کی زبان سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ عام طور پر گیت میں مقامی زندگی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ گیتوں کا تعلق موسموں،فصلوں اور مختلف رسموں سے زیادہ ہے۔شادی بیاہ کے گیت بھی بہت مقبول ہیں۔ زبان اور آہنگ کے اعتبار سے گیت میں دل کے تاروں کو چھو لینے والی کیفیت ہوتی ہے۔ گیت کی فضا رومانی ہوتی ہے۔موسموں کے رنگ، پیار کی ترنگ، زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں، الجھنیں اور معاشرے کے مختلف روپ، یہ تمام چیزیں مل کر گیت کو بہت دل چسپ بنا دیتی ہیں۔

اُردو کے گیت نگاروں میں عظمتؔ اللہ خاں،اخترؔ شیرانی، حفیظؔ جالندھری، آرزوؔ لکھنوی، شادؔ عارفی، میرا جیؔ ، مخدومؔ ،سلامؔ مچھلی شہری ،راجہؔ مہدی علی خاں،قتیلؔ شفائی،جمیلؔ الدین عالی ، ندؔا فاضلی اور زبیر رضوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

شادؔ عارفی

(1900–1964)

شادؔ عارفی کا وطن رام پور، (یوپی) تھا۔ شادؔ عارفی نے شاعری کا جو اسلوب اختیار کیا اس میں تیکھے پن، طنز اور تلخی کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور سپاٹ ہے جس میں بے تکلفی اور طنز پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل ایک نئے جمالیاتی احساس کا پتا دیتی ہے۔ نئی غزل کے اوّلین نشانات جن شاعروں کے یہاں ملتے ہیں، ان میں شادؔ کا نام بھی شامل ہے۔ زندگی سے ان کا رشتہ ہمیشہ حریفانہ رہا۔ زندگی کی طرح ان کی شاعری میں بھی مزاحمت کا عنصر بہت واضح ہے۔ ان کے مجموعے 'شوخیِ تحریر' اور 'سفینہ چاہیے' جدید نظم و غزل کے نمائندہ مجموعوں میں شامل ہیں۔

غزل کے علاوہ شادؔ عارفی کے گیت بھی اہم ہیں، انھوں نے مختلف موضوعات پر گیت کہے ہیں۔

یہ ہماری زبان ہے پیارے

یہ ہماری زبان ہے پیارے　　شعر و نغمہ کی جان ہے پیارے
اک بڑی داستان ہے پیارے
لشکروں کی، حکومتوں کی قسم　　کاروباری سہولتوں کی قسم
تاجرانہ ضرورتوں کی قسم
تھی یہ آپس کے میل جول کی بات　　اس میں شامل ہے دیس دیس کی بات
قیدِ مذہب نہ شرط قوم نہ ذات
اس میں لہجے کی خوشگواری ہے　　لفظ و معنی کی پاس داری ہے
سب کی ہمدم ہے سب کی پیاری ہے
دل کو چھوتے ہیں اس کے میٹھے بول　　نہ تنافر کہیں نہ حشو نہ جھول
اس کی محفل کے سب رتن انمول
رفتہ رفتہ جنم لیا اس نے　　ہر سبق بیش و کم لیا اس نے
ریختہ بن کے دم لیا اس نے
تازہ دم ہوکے برِبنائے سکوں　　مسئلے حل کیے، لکھے مضموں
اور اپنا لیے علوم و فنوں
علم و فن پر عبور ہونے سے　　ناتمامی کے دُور ہونے سے
برتری کا شعور ہونے سے

اب دھنش کے سمان ہے اُردُو اب ترنگا نشان ہے اُردو
اب ہماری زبان ہے اُردو

(شادؔ عارفی)

مشق

سوالات

1۔ گیت کے پہلے اور دوسرے بند میں شاعر نے اردو زبان سے متعلق کن باتوں کا ذکر کیا ہے؟
2۔ لہجے کی خوش گواری اور لفظ و معنی کی پاس داری سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
3۔ آخری بند میں شاعر نے اردو زبان کے لیے کیا کیا مثالیں پیش کی ہیں؟